Al Islam Message

الاسلام مشن کا ترجمان

زیر نگرانی

مولانا ارشد جمال

■ ■ ■ ■ ■

Al Islam message

Urdu quarterly literature

D.43/107-Bazar Sadanand.

Varanasi, U.P. (India) 221001

Mob: +91-9307324317

E-mail:info@alislammission.com

October to December 2011

<<<<<<>>>>>>

معرفت اور عبادت

سورۃ "الذاریات" کی ایک آیت ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّالِیَعْبُدُوْنَ (56) یعنی میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا۔ بعض مفسرین نے "لِیَعْبُدُوْن" کی تفسیر اُس کے معروف معنیٰ "عبادت" سے کی ہے، لیکن امام مجاہد نے اُس کی تفسیر "اِلَّالِیَعْرِفُوْن" سے کی ہے۔
(تفسیر الثعلبی: 9/120، تفسیر البغوی: 7/380، تفسیر القرطبی: 19/507)

اُس وقت آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ: میں نے جن وانس کو صرف اپنی "معرفت" حاصل کرنے کے لئے پیدا کیا۔ بظاہر اِن دونوں تفسیروں میں تضاد نظر آتا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے اُن میں کوئی تضاد نہیں۔ جیسے کوئی آدمی یہ کہے کہ میری دلی تمنا ہے کہ میرا بیٹا دنیا میں میرا نام روشن کرے۔ پھر دوسری بار وہ یہ کہے کہ میری دلی تمنا ہے کہ میرا بیٹا اچھا خاصا لکھ پڑھ لے۔ بظاہر دونوں باتوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے، لیکن اُن میں کوئی تضاد نہیں۔ پہلی بات جو اُس آدمی نے اپنے بیٹے کے حق میں کہی وہ نتیجے کے اعتبار سے ہے اور دوسری بات کام کی شروعات کے اعتبار سے ہے۔ گویا اُس آدمی کی پوری بات اِس طرح ہوگی کہ "میری دلی تمنا ہے کہ میرا بیٹا اچھا خاصا لکھ پڑھ کر دنیا میں میرا نام روشن کرے"۔ اب دیکھئے دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں رہ گیا ہے۔ جب تک بیٹا لکھ پڑھ کر ماہر نہیں ہو جاتا، تب تک وہ دنیا میں اپنے باپ کا نام روشن نہیں کر سکے گا۔ یوں ہی عبادت اور معرفت کو بھی سمجھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو عبادت کے لئے پیدا کیا یا معرفت کے لئے؟ دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ بندے عبادت کے لئے بھی ہیں اور معرفت حاصل کرنے کے لئے بھی۔ عبادت نتیجے کے اعتبار سے ہے اور معرفت ابتدا کے اعتبار سے۔ بندے پھیلی ہوئی کائنات میں غور وفکر کر کے اور اپنے آپ میں جھانک کر پہلے اللہ کی معرفت حاصل کریں، پھر وہ اللہ کی عبادت کریں۔ جس کو اللہ کی سچی معرفت حاصل ہوگی، وہ خود کو اللہ کی عبادت کے لئے بے چین پائے گا۔ بغیر معرفت کے جو عبادت کے لئے آگے بڑھے گا، وہ بس ایک خانہ پُری ہوگی اور وہ ایک رسم نبھا آئے گا۔ کام کی ابتدا کے بغیر کوئی نتیجے تک کیسے پہنچ سکتا ہے، اِس لئے آیت کی تفسیر "معرفت" سے کرنا زیادہ بہتر ہے۔ یہی بات مفسّر ثعلبی نے لکھی ہے: " **ولقد احسن فی ھذا القول لانہ لو لم یخلق لما عرف وجودہ وتوحیدہ** "۔ (تفسیر الثعلبی: 9/120)

مفسر بغوی اور قرطبی نے اُس کی تائید کی ہے۔(تفسیر البغوی:7/380،تفسیر القرطبی:19/507)

امام مجاہد نے جو تفسیر کی ہے، وہ بہتر تفسیر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ چیز بہت پسند ہے کہ اُسے اور اُس کی توحید کو لوگ جانیں، اِسی کا نام معرفت ہے اور اسی چیز کے لئے اُس نے انسانوں کو پیدا کیا۔ اب بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی معرفت کے لئے پیدا کیا۔ معرفت، عبادت کا صرف ابتدائی حصہ نہیں، بلکہ یہ عبادت کی بنیاد ہے، اُس کی جان اور اُس کی روح ہے۔ عبادت کے ہر لمحے میں معرفت کا ہونا ضروری ہے، اِس کے بغیر ساری عبادت بے بنیاد عمارت کی طرح ہے یا بے جان جسم کے مانند ہے۔

اللہ کی معرفت ہوتے ہی انسان کے اندر یہ احساس جاگ اٹھتا ہے کہ صرف اُسی کی واحد ذات ہے جو عبادت کے لائق ہے۔ اِس طرح وہ اللہ کی عبادت کا اقرار و اعتراف کرنے والا بندہ بن جاتا ہے۔ یہ "اقرار" اتنی شدت کے ساتھ ہوتا ہے کہ خارجی دباؤ کی وجہ سے اگر اُس کا نفس اُسے اِس طرف سے پھیرنا بھی چاہے تو نہیں پھیر پاتا، نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے کم از کم دل میں اقرار کرنا ہی پڑتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مذکورہ آیت کی تفسیر میں معرفت کے اِسی پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: " اِلَّا لِيُقِرُّوْا بِالْعُبُوْدِيَّةِ طَوْعاً اَوْ كَرْهاً "یعنی میں نے جن و انس کو اِس لئے پیدا کیا تاکہ وہ خواہی نخواہی میری عبادت کا اقرار کریں۔(تفسیر الطبری:21/554،تفسیر ابن ابی حاتم: 10/3311،تفسیر القرطبی:19/507،تفسیر ابن کثیر 7/425)

معرفت کے بغیر اقرارِ عبادت نہیں۔ گویا حضرت عبداللہ ابن عباس نے اپنی تفسیر میں معرفت کے دوسرے درجے کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی حقیقت میں ایک ہی تفسیر کے دو رُخ ہیں، اِن میں کوئی تضاد نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو تفسیر مروی ہے وہ یہ ہے کہ میں نے جن و انس کو اِس لئے پیدا کیا کہ میں اُنھیں عبادت کا حکم دوں۔ "اِلَّا لِاٰمُرَهُمْ بِالْعِبَادَةِ"۔(تفسیر القرطبی،19/507،تفسیر البغوی:7/380)

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ " لِيَعْبُدُوْنِ " کا وضاحتی معنی ہے۔ یعنی عبادت کے لئے پیدا کرنا یا عبادت کا حکم دینا، بات ایک ہی معلوم ہوتی ہے، لیکن ایسا نہیں۔ حضرت علی نے معرفت و عبادت کی

ایک دوسری حقیقت کو کھولا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بندے کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے، لیکن وہ یکساں طور پر ہر بندے کو عبادت کا حکم نہیں دیتا، بلکہ وہ صرف اُنہی بندوں کو حکم (امر) فرماتا ہے جو اپنے اندر معرفت اور اقرارِ عبادت کا جذبہ پیدا کر چکے ہوں۔ عبادت کے لئے پیدا کرنا الگ چیز ہے اور عبادت کا حکم دینا الگ بات ہے۔ ہر انسان دنیا میں کچھ کام کرنے ہی کے لئے آیا ہے، لیکن باپ اپنے کسی بچے کو پیدا ہوتے ہی کسی کام کا حکم نہیں دیتا۔ جب اُس کا بچہ باشعور ہو کر کچھ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تب اُسے کسی کام کا حکم دیا جاتا ہے۔

حضرت علی نے اپنی تفسیر میں خدا کے تشریعی راز کو کھولا ہے۔

معرفت کی سب سے اعلیٰ غذا، قدرت کے وہ مظاہر ہیں جو کائنات میں ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں یا خود انسان کے اندر کسی قیمتی خزانے کی طرح چھپے ہوئے ہیں۔ دانا انسان آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو اُسے ہر طرف خالق کے جلوے نظر آتے ہیں یا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھتا ہے تو اُسے اندر سے قدرت کی روشنی چھن چھن کر نکلتی نظر آتی ہے۔ اِسی کو قرآن میں ''انفس و آفاق کی آیات'' کہا گیا ہے۔ لیکن غافل اور نادان آدمی قدرت کے اُنہی مظاہر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سب کچھ law of nature (قانونِ فطرت) کے تحت ہو رہا ہے۔ وہ جسم کے پیچیدہ نظام کو میڈیکل سائنس کی روشنی میں دیکھتا اور کہتا ہے کہ یہ بھی ایک نیچر ہے۔ جو چیز معرفت کی طرف سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ لے جانے والی تھی، اُسی کو اندھے انسان نے نظر انداز کر دیا۔ اُنھوں نے کائنات کے زبردست نظام کو دیکھا اور شعور بیدار نہ ہوا۔ اُنھوں نے جسم کے پیچیدہ نظام کو دیکھا اور ذہن کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ ہر چیز پر law of nature (قانونِ فطرت) کا لیبل (label) لگایا اور آگے بڑھ گئے۔ سائنسی اصولوں کے مطابق قانونِ فطرت کا مطالعہ کرنے والوں کو سب سے زیادہ خالق کی معرفت ہونی چاہئے تھی، لیکن وہی اِس دور میں سب سے بڑے ملحد نظر آنے لگے۔ جن چیزوں سے خالق کے وجود پر سب سے زیادہ دلیلیں فراہم ہوتی ہیں، اُنہی چیزوں کی بنیاد پر وہ خالق کے سب سے زیادہ منکر ہو بیٹھے۔ اُنھوں نے فطرت کا مطالعہ عجز کی نفسیات کے ساتھ کیا ہوتا تو اُن پر معرفت کے دروازے کھلتے۔ لیکن اُنھوں نے فطرت کا مشاہدہ کبر کے جذبات کے ساتھ کیا تو گمراہ ہو گئے۔ خالق کی معرفت کے بجائے اُنھیں 'انا' کا عرفان حاصل ہوا، اِس لئے اپنے سے زیادہ برتر ہستی کا انکار کر بیٹھے۔

شرک فی الرسالۃ

رسول کی جو سب سے بڑی حیثیت ہے، وہ آمر وناہی کی حیثیت ہے۔ یعنی رسول کے ہر حکم کو مانا جائے اور اُس کی منع کی ہوئی ہر چیز سے رُکا جائے۔ قرآن کی ایک آیت میں رسول کی اِسی حیثیت کا ذکر ہوا ہے: وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر: 7) رسول تمھیں جو کچھ دیں، اُسے لے لو اور جس چیز سے روکیں، اُس سے باز آؤ۔

آیت میں ''الرسول'' کہا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ صرف الرسول کی یہ حیثیت ہے کہ اُس کے امر ونہی کو ہر حال میں تسلیم کیا جائے اور اُس سے اختلاف نہ کیا جائے۔ الرسول کے واضح امر ونہی کے مقابلے میں ہر اجتہاد گمراہی ہے۔ یوں ہی اگر کوئی ''الرسول'' کے علاوہ کسی دوسرے کو اِس حیثیت سے لیتا ہے کہ وہ اُس کے ہر امر ونہی (فتوے) کو تسلیم کرنا واجب سمجھتا ہے اور اُس سے اختلاف کرنا جائز سمجھتا ہے تو گویا وہ اُسے ''الرسول'' کے درجے میں رَکھ میں رہا ہے۔ ''الرسول'' کے پیغمبرانہ منصب پر وہ دوسرے کو بٹھا رہا ہے۔ اِسی کو اصطلاحی طور پر ''شرک فی الرسالۃ'' کہا گیا ہے۔

صحابہ اور تابعین کا زمانہ اِس خرابی سے پاک تھا۔ اُس کے بعد یہ بیماری پیدا ہوئی اور دھیرے دھیرے وَبا کی طرح پورے مسلم معاشرے میں پھیل گئی۔ اَب حال یہ ہے کہ مسلمانوں میں سیکڑوں جماعتیں ہیں اور ہر جماعت نے کسی ایک مولوی، مفتی، امام اور پیر کو یہ حیثیت دے رکھی ہے کہ اُس کے نزدیک بس وہی قابلِ اعتماد ہے، اُسی کا قول حرفِ آخر ہے۔ اُس سے ہٹ کر سوچنے اور کہنے والا، غلط، گمراہ، مُلحد اور بے دین ہے۔ جو لوگ شرک فی الرسالۃ میں مبتلا ہوئے، وہ اجتہاد سے محروم ہو گئے۔ جن کے یہاں 'بڑی شخصیتوں' سے علمی اختلاف جائز ہے، اُن کے یہاں اجتہادی شان کے لوگ موجود ہیں۔ شرک فی الرسالۃ میں پڑنے والوں کا علم منجمد اور فکر محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ صحابہ، تابعین اور صالحینِ اُمت کا علم وسیع اور فکر اعلیٰ اِسی لئے تھی کہ وہ شرک فی الرسالۃ سے کوسوں دور تھے۔ اِسی لئے اُن میں ہزاروں کی تعداد میں مجتہد پیدا ہوئے۔ بعد کے زمانوں میں دھیرے دھیرے مجتہدین کا فیصد کم ہوتا گیا، اُس کی ایک بڑی وجہ یہی شرک فی الرسالۃ تھی۔ بیسویں صدی میں لوگ اتنی بڑی تعداد میں شرک فی الرسالۃ کے شکار ہوئے کہ اُنھوں نے شعوری اور غیر شعوری طریقے پر اجتہاد کے دروازے ہی کو بند کر دیا۔ اب اجتہاد کا دروازہ کھٹکھٹانے والا گمراہ قرار پائے گا۔

شکر کی غلط تعبیر

دہلی کے ایک معروف اسلامی اسکالر ہیں، جو اپنی فکر میں الگ تھلگ واقع ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے ایک صفحہ کے مضمون میں لکھا ہے کہ: ''ایک حیوانی شکر ہے اور ایک انسانی شکر۔ اگر آپ لذیذ کھانا کھائیں اور اُس کو کھا کر الحمدللہ کہیں تو یہ حیوانی درجے کا شکر ہے۔ انسان کے درجے کا شکر یہ ہے کہ جب کھانا آپ کے سامنے آئے تو اُس کو دیکھ کر خدا کا تخلیقی نظام آپ کو یاد آجائے۔ آپ سوچیں کہ خدا نے ایک برتر عمل کے ذریعے غیر غذا کو غذا میں تبدیل کر دیا۔ پھر آپ یہ سوچیں کہ یہ غذائی چیزیں ایک پیچیدہ نظامِ ہضم کے ذریعے میرے جسم میں گوشت اور خون جیسی چیزوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ شکر کے اعلیٰ احساس میں جینے کے لئے انسانی درجے کا جذبۂ شکر درکار ہے مگر یہی وہ چیز ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ کم پائی جاتی ہے۔ (وقلیل من عبادی الشکور)......مختصراً''۔

یہ شکر کی انتہائی غلط تعبیر ہے۔ کائنات کے تخلیقی نظام کا علم، جدید سائنس کے ذریعے ممکن ہوسکا ہے اور جسم کے پیچیدہ نظامِ ہضم کا علم، قدیم طبی تجربہ کے ذریعے ممکن ہوسکا ہے جو صحابہ اور تابعین کے بہت بعد کے دور کی بات ہے۔ شکر کی اِس تعبیر کو اگر صحیح مان لیا جائے تو لازم آئے گا کہ وہ تمام صحابہ، تابعین اور صلحائے امت جو کائنات کے تخلیقی نظام سے ناواقف تھے اور جسم کے پیچیدہ نظامِ ہضم کا تفصیلی تجربہ اُن کو نہیں تھا، وہ سب کے سب انسانی درجے کے جذبۂ شکر سے محروم تھے اور وہ شکر کے اعلیٰ احساس کے بغیر زندگی گزار رہے تھے۔ آج ہمارے پاس جدید سائنس اور جدید طبی تجربہ ہے جس کی روشنی میں ہم شکر کے معاملے میں انسان ثابت ہوئے اور ہمارے اَسلاف حیوان کے حیوان رہ گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شکر کی یہ غلط تعبیر، صحابہ اور تابعین کی بہت بڑی تصغیر ہے۔

شکر کا معاملہ بہت سادہ معاملہ تھا۔ شکر کی صحیح اسلامی تشریح یہ ہے کہ جب کسی کو کوئی نعمت (کھانا، پانی، پیسہ، عزت وغیرہ) ملے تو اُس کے اندر شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہو کہ یہ نعمت خدا کی طرف سے ہے، اِس میں میرا کچھ دخل نہیں، یہ ابتدائی درجے کا شکر ہے اور یہی بنیادی طور پر شکر ہے۔ پھر اُس احساس کے پیدا ہونے سے بے ساختہ اُس کی زبان سے الحمدللہ جیسے کلمات نکل پڑیں، یہ دوسرے درجے کا شکر ہے اور پھر شدّتِ احساس اتنا زیادہ ہو کہ وہ خدا کے سامنے اپنا سر زمین پر رکھ دے۔ یہ شکر کا انتہائی درجہ ہے۔ زیادہ تر لوگ بغیر کسی احساس کے رسماً اور عادۃً الحمدللہ کہتے ہیں، وہ حقیقی معنوں میں اللہ کے شکر گزار بندے نہیں ہیں۔ اِسی لئے کہا گیا ہے: (وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ)

سونے کا پہاڑ

امام طبرانی نے المعجم الکبیر میں ایک حدیث روایت کی ہے جو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ قریش نے اللہ کے نبی ﷺ سے کہا کہ آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لئے صفا پہاڑ کو سونے کا پہاڑ بنادے۔ اگر وہ سونے کا پہاڑ ہوگیا تو ہم آپ کو مان لیں گے۔ آپ نے اپنے رب سے دعا کی تو جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: آپ کا رب آپ کو سلام پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر آپ کہیں تو ''صفا'' اُن کے لئے سونے کا پہاڑ ہوسکتا ہے۔ اُس کے بعد بھی جو کافر رہے گا تو میں اُسے ایسا عذاب دوں گا کہ سارے عالم میں ویسا عذاب کسی پر نہ آیا ہوگا اور اگر آپ چاہیں تو میں اُن کے لئے توبہ اور رحمت کا دروازہ کھلا رکھوں۔ آپ نے جواب دیا: بلکہ توبہ اور رحمت کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔ (المعجم الکبیر:[12736]12/152)

پیغمبر اِس بات پر آمادہ ہوگئے تھے کہ وہ دُعا کرکے صفا کو سونے کا پہاڑ بنادیں۔ آپ کو اِس کا بہت زیادہ شوق تھا کہ سارا قریش مسلمان ہوجائے۔ آپ کو یہ سوچ سوچ کر بہت زیادہ صدمہ پہنچتا تھا کہ میری اَنتھک کوششوں کے باوجود قریش ایمان لانے کو تیار نہیں۔ یہ صدمہ اتنا زیادہ گہرا تھا کہ لگتا تھا آپ کی جان گھلی جارہی ہے۔ اب آپ کے سامنے دو آپشن تھے: ایک سونے کا پہاڑ، دوسرے رحمت کا دروازہ۔ سونے کا پہاڑ، رِسکی معاملہ تھا، کیونکہ قریش کو ساری پریشانی آپ کی نبوت سے تھی۔ وہ کسی قیمت پر آپ کی نبوت کو جمنے دینا نہیں چاہتے تھے۔ آپ کو نبی ماننے کا مطلب تھا، زندگی کے پرانے ڈھانچے کو بری طرح سے گرادینا۔ دوسرے لفظوں میں قریش کی چودھراہٹ کا خاتمہ۔ سونے کا پہاڑ لے لینے کے بعد بھی وہ انکار کر بیٹھتے۔ انکار کی صورت میں اُنھیں بھاری قیمت چکانی پڑتی۔ پیغمبر کو قریش کی طبیعت معلوم تھی۔ خدا کا فیصلہ سن کر اُنھیں آگے خطرہ نظر آنے لگا۔ سونے کے پہاڑ کو پتھر کا پہاڑ رہنے دیا۔ اُنھیں آنے والے عذاب سے بچالیا۔ داعی ہونے کی حیثیت سے آپ کو اپنی مدعو قوم سے جو محبت تھی اُس کی مثال دوسرے پیغمبروں کے یہاں نہیں ملتی۔ دعوت کا تقاضا یہ ہے کہ آخری حد تک مدعو قوم کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ رکھا جائے۔ سونے کے پہاڑ کے لئے آپ اِس لئے راضی ہورہے تھے کہ آپ کی قوم ایمان لائے۔ آپ نے سونے کے پہاڑ کا مطالبہ چھوڑ بھی اِسی لئے دیا کہ قریش کے لئے آخری حد تک ایمان لانے کا موقع دیا جائے۔ اِسی اعلیٰ فکر اور کردار کی بنیاد پر آپ کو قرآن میں رحمۃ للعلمین کہا گیا ہے۔

کائنات کی وسعت

BBCUrdu.com میں ،20 اگست 2010 کو ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا: کائنات سدا پھیلتی رہے گی۔

اِس رپورٹ میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ کہکشاؤں کا مشاہدہ کرنے والی ایک دوربین سے معلوم ہوا ہے کہ شاید کائنات کی وسعت میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے گا۔ ماہرین فلکیات نے معلوم کیا کہ دور دراز ستاروں سے آنے والی روشنی، "ایبل 1689" نامی کہکشاؤں کے جھرمٹ کے قریب سے گزرنے پر بگڑ جاتی ہے۔ اُنھوں نے روشنی میں اس تبدیلی سے کائنات میں موجود پوشیدہ توانائی کی مقدار کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ پوشیدہ توانائی ایک پراسرار طاقت ہے جو کائنات کے پھیلاؤ کے عمل کو تیز کرتی ہے۔ ماہرین فلکیات نے کائنات میں اس توانائی کے پھیلاؤ کے بعد اندازہ لگایا کہ شاید کائنات کا نصیب سدا پھیلتے رہنا ہے۔

یہ ایک سائنسی انکشاف ہے۔ اسلام، سائنس کے خلاف نہیں۔ حیرت انگیز طور پر بہت سے سائنسی انکشافات کا بیان پہلے ہی سے قرآن کے اندر موجود ہے۔ کائنات کے پھیلتے رہنے کی جو نئی دریافت سائنسدانوں نے کی ہے، اُس کا واضح بیان قرآن کے اندر پایا جاتا ہے۔ قرآن کی سورۃ الذاریات کی ایک آیت ہے: وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ (۴۷) جس کا صاف ترجمہ یہ ہے: اور ہم نے آسمان کو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور بے شک ہم اُسے ضرور وسعت دینے والے ہیں۔ اِس آیت میں ''السماء'' وسیع خلاء کے معنی میں ہے۔ کائنات کا سارا کہکشانی نظام خلاء میں واقع ہے۔ خلاء کو وسعت دینے کا سیدھا مطلب ہے، کائنات کو پھیلانا۔ کائنات کے سدا پھیلتے رہنے کی جو بات سائنسدانوں نے دریافت کی ہے، وہ پہلے ہی سے قرآن میں پائی جاتی ہے۔ سائنس کی اِس دریافت نے ثابت کر دیا کہ قرآن کوئی پچھڑی ہوئی کتاب نہیں ہے، بلکہ اُس کی بہت سی آیتوں کے باطن کو سمجھنے کے لئے سائنس کی ضرورت ہے۔ گزشتہ صدیوں میں سائنس کا علم ظاہر نہیں ہوا تھا اور نہ ہی سائنسی دریافت شروع ہوئی تھی، اِس لئے عام طور پر مفسرین نے ''لَمُوسِعُونَ'' سے آسمان کی نامعلوم وسعت، یا آسمان و زمین کے درمیان کی وسعت مراد لی ہے، یا موجودہ آسمان کی طرح ایک اور وسیع آسمان پیدا کرنے کی قدرت مراد لی ہے۔ سائنس تمام مذہبی کتابوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئی تھی، لیکن قرآن دورِ سائنس میں داخل ہو گیا۔

تنقید کی جرأت

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اُن بارہ اَنصار صحابہ میں سے ایک ہیں جو نبوت کے بارہویں سال، ہجرت سے پہلے، منیٰ کی گھاٹی میں ہونے والی پہلی بیعت کے موقع پر حاضر تھے، جسے تاریخ میں ''بیعۃ عقبہ اولیٰ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اُنھیں جنگِ بدر میں شریک ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ایک بار یہی حضرت عبادہ بن صامت، امیر معاویہ کے ساتھ مسجد میں حاضر تھے۔ اتنے میں اذان ہوئی اور خطیب کھڑا ہوکر امیر معاویہ کی مدح کرنے لگا اور اُن کے لئے تعریفی جملے بولنے لگا۔ یہ دیکھ کر حضرت عبادہ بن صامت اُٹھے اور مٹھی بھر مٹی لے کر خطیب کے منہ میں بھر دیا۔امیر معاویہ کو اِس پر بڑا غصہ آیا تو حضرت عبادہ بن صامت نے کہنا شروع کیا: آپ اُس موقع پر موجود نہیں تھے، جب ہم نے منیٰ کی گھاٹی میں اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی تھی کہ ہم چستی اور سستی میں ناگواری اور بے بسی میں آپ کی بات سنیں گے اور مانیں گے، ہم کسی معاملے میں اُس کے ذمہ دار سے جھگڑا نہ کریں گے، ہم جہاں رہیں گے حق پر ڈٹے رہیں گے، ہم اللہ کے کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''اِذَا رَأیتُمُ الْمَدَّاحِیْنَ فَاحْثُوْا فِی اَفْوَاھِھِم التُّرَاب'' ۔جب تم تعریف کا پل باندھنے والوں کو دیکھو تو اُن کے منہ میں مٹی بھر دو۔(سیر اعلام النبلاء: 2/7) حضرت عبادہ بن صامت نے حاکمِ وقت کے خلاف تنقید کی جرأت کی تھی۔ یہ ایک صالح تنقید تھی۔صالح تنقید کا معیار کتاب وسنت ہے۔جیسا کہ حضرت عبادہ نے ایک حدیث کی روشنی میں عملاً تنقید کی تھی۔ جو تنقید اِس معیار سے گری ہوئی ہو وہ تنقید نہیں، عیب جوئی ہے، کینہ پروری اور گالی گلوج ہے۔پھر صالح تنقید کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ''اطاعت'' کے جذبے سے ہو، ایسا نہ ہو کہ تنقید کے پردے میں، کتاب وسنت کا آڑ لے کر کوئی اپنے دل کی بھڑاس نکالے۔اپنی قابلیت بگھارنے اور دوسرے کو نیچا دکھانے کی غرض سے تنقید کرنا تنقید نہیں، منافقت ہے۔تنقید کے لئے اخلاص کی ضرورت ہے۔جیسا کہ حضرت عبادہ پورے اخلاص سے، رسول سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق تنقید کرنا ضروری سمجھ رہے تھے۔صالح تنقید کے لئے یہ دو ضروری شرطیں ہیں۔آج کل تنقید کی آزادی کے نام پر لوگ دوسروں کا دل دُکھانے اور اپنی برتری جتانے کے لئے، کتاب وسنت سے ہٹ کر باتیں کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ تنقید ہے۔اِسی لئے لوگوں کے ذہنوں پر اُس کا برا اثر پڑتا ہے۔

خاکساری

میں ایک بار ٹرین کے سلیپر کلاس میں سفر کررہا تھا۔ میں جس سیٹ پر تھا وہیں سامنے دو جوان آدمی اپنی اپنی برتھ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ٹرین جب ایک اسٹیشن پر رکی تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہمارے کوچ (coach) میں داخل ہوئی۔ اتفاق سے وہ چلتے ہوئے اُنہی دونوں میں سے ایک کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ اُس آدمی کے لیٹے رہنے کے باوجود برتھ پر تھوڑی سی جگہ خالی رہ گئی تھی۔ عورت نے اُس آدمی سے خالی جگہ میں بیٹھنے کی اجازت چاہی، مگر آدمی نے انکار کردیا۔ بعض مسافروں نے عورت کی وکالت کرتے ہوئے اُس آدمی کو ملامت کی اور عورت کو زور دے کر کہا کہ وہ اُسی جگہ بیٹھے، لیکن آدمی نے سختی سے جب منع کردیا تو اُس عورت نے وہیں برتھ کے قریب فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا: جب تک یہ خود نہیں کہیں گے تب تک میں اِن کے برتھ پر نہیں بیٹھوں گی۔ عورت نے کوئی زور بردستی نہیں کی اور نہ ہی کچھ لعنت ملامت کی۔ اُس نے پورے طور پر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا اور نہایت خاکساری کے ساتھ برہنہ فرش پر بیٹھ گئی۔

وہ آدمی اُس عورت کے اِس طرح فرش پر بیٹھ جانے کو بڑے تعجب سے دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔ ٹرین ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ اُس آدمی نے عورت سے گفتگو شروع کردی اور اُس کا حال دریافت کرنے لگا۔ گفتگو کے دوران اچانک آدمی کے منہ سے ایک جملہ نکلا کہ ''برتھ پر بیٹھ جاؤ''۔ اُس نے عورت کو مخاطب کرکے کہا تھا۔ چنانچہ عورت فرش سے اُٹھ کر برتھ پر بیٹھ گئی۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟ جو آدمی حقارت سے اُس عورت کو منع کررہا تھا، ابھی کچھ ہی دیر میں وہ ہمدردی سے بیٹھنے کی اجازت دینے لگا! یہ صرف اُس عورت کی خاکساری کی برکت تھی۔ خاکساری سے لوگوں کی ہمدردی حاصل ہوتی ہے۔ خاکسار آدمی کی پریشانی پر لوگوں کو ترس آتا ہے۔ اگر اُس عورت نے آدمی سے سیٹ کے لئے جھگڑا کرلیا ہوتا تو وہ آدمی کبھی اُس عورت کو اپنی برتھ پر نہ بٹھاتا۔ خاکسار آدمی وقتی طور پر نیچا دکھائی دیتا ہے، حالانکہ وہ اوپر جانے کے لئے ابھی نچلے زینہ پر ہوتا ہے۔ خاکساری، نیچے سے اُوپر جانے کا نام ہے اور گھمنڈ اوپر سے نیچے گرنے کا نام ہے۔ اِسی لئے ایک حدیث میں آیا ہے: ''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ''۔ (شعب الایمان: فصل فی التواضع) جو اللہ کے لئے خاکساری دکھلائے گا، اللہ اُسے بلند کردے گا۔ میں نے اپنے ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو فرش سے اُٹھا کر برتھ پر بٹھادیا۔

بھیانک ہمدردی

مجھے ایک مرتبہ جموں (کشمیر) میں ایک صاحب سے گفتگو کا اتفاق ہوا۔ وہ پیشے سے وکیل تھے۔ اُنھوں نے وکالت کے پیشے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ بڑا اچھا پیشہ ہے۔ اِس پیشے کی خوبی بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے مثال دی کہ اگر کسی نے ایک آدمی کا قتل کر دیا، قاتل پکڑا گیا اور کورٹ میں اُس کا کیس پہنچا۔ اب وکیل اُس قاتل کی وکالت کرتا ہے اور پوری کوشش کرتا ہے کہ قاتل کو بچا لیا جائے اور اُسے کوئی سزا نہ ہو۔ وکیل یہ کرتا ہے کہ ایک آدمی کی تو جان جا چکی ہے اب دوسرے کی جان کیوں لی جائے؟ قاتل کو قتل کرنے سے مقتول زندہ تو نہیں ہو جائے گا؟

بظاہر یہ بڑا خوبصورت فلسفہ ہے، لیکن اِس کا جو نتیجہ سامنے آ رہا ہے وہ بے حد خطرناک ہے۔ قاتل کو پتہ ہے کہ سزا کا معاملہ ثبوت اور گواہی پر نہیں، بلکہ وکیل کی بحث پر ہے اور اُس کا وکیل اُسے بچا لے گا۔ اِس لئے قاتل بے فکر اور نڈر ہے۔ وہ آئندہ مزید کسی قتل میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔ وکیلوں کی اِسی خطرناک پالیسی کی وجہ سے ہندوستان میں قتل کا کیس بڑھتا جا رہا ہے۔ وکیلوں کی ذمہ داری ہے کہ پہلے وہ اپنے اِس خطرناک فلسفے کو دفن کریں اور قاتل کو بہر حال سزا دلانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائیں۔ قتل کو اگر کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف سزا ہے۔ اِس سے ہٹ کر دنیا کا کوئی فلسفہ اور قانون انسانی جانوں کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اِس سے زیادہ کوئی معقول اور مناسب قانون نہیں ہو سکتا۔ اسلام اِسی قانون کی وکالت کرتا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى (البقرۃ:178) اے ایمان والو! تم پر قتل کے معاملے میں ''قصاص'' (بدلہ) کا قانون نافذ کیا گیا۔

جب قصاص کا قانون لاگو ہوگا تو قاتل کی ہمت پست ہو جائے گی۔ قاتل قتل کی جرأت کرنے سے گھبرائے گا۔ اِس طرح انسانی جانوں کو تحفظ ملے گا۔ لوگ مارے نہیں جائیں گے۔ معاشرے میں زندگی بحال رہے گی۔ اسلام اِسی فکر وفلسفہ کی ترجمانی کرتا ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ یعنی اے دانشمندو! تمھارے لئے ''قصاص'' میں زندگی ہے۔ (البقرہ:179)

وکیلوں کو چاہئے کہ وہ اِسی فکر وفلسفہ کو اپنی وکالت کا معیار بنائیں۔ قاتل کو بچانے کی پالیسی نے ملک میں قتل کا کیس بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ دو چار قاتلوں کو نہ بچا کر پورے سماج کو قتل ہونے سے بچایا جائے۔ قاتلوں کے گروپ کو پکڑ کر پورے ملک کو خون میں لت پت ہونے سے بچایا جائے۔

ڈراؤنی شخصیت

انسان کی شخصیت دو طرح کی ہوتی ہے۔ایک پیاری شخصیت، دوسری ڈراؤنی شخصیت۔
پیاری شخصیت کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ آدمی لوگوں سے ہنس کر ملنے والا ہو، اپنے محلے ٹولے میں ہر دلعزیز اور دوستوں میں بے حد مقبول ہو، بلکہ حقیقت میں پیاری شخصیت والا وہ ہے جس سے لوگ مطمئن رہتے ہوں اور اُس کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہ کرتے ہوں۔اُس کا پڑوسی چین کی نیند سوتا ہو اور اُس کا ماتحت پُرسکون رہتا ہو، گویا وہ بالکل بے ضرر قسم کا انسان ہو۔

ڈراؤنی شخصیت والا آدمی ٹھیک اِس کا اُلٹا ہوتا ہے۔لوگ اُسے دیکھ کر بدکتے ہیں، اُس کی آمد یا پکار پر ماتحتوں کے دل ڈوبنے لگتے ہیں، اُس کے پڑوسیوں پر بے چینی کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اُس کے بال بچے تک سہمے سہمے سے رہتے ہیں۔

ڈراؤنی شخصیت رکھنے والا پورا مومن نہیں ہوتا اور نہ اِس لائق رہتا ہے کہ مرنے کے بعد اُسے جنت میں جانے دیا جائے۔چاہے وہ کتنا ہی بڑا اعبادت گذار، مرتبے والا اور عزت دار ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی اِس حدیث سے سمجھ میں آتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

''وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کا پڑوسی اُس کی مصیبتوں اور شرارتوں سے مطمئن نہ رہتا ہو''۔[مسلم: کتاب الایمان/باب بیان تحریم ایذاء الجار(73)

یوں تو کسی کے لئے بھی ڈراؤنی شخصیت بن جانا برا ہے، لیکن وہ شخص انتہائی برا ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بھی ڈراؤنی شخصیت اختیار کرلیتا ہے، جبکہ پڑوسی عزت اور نیک برتاؤ کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بڑی ہی پیاری شخصیت عطا فرمائی تھی۔قرآن نے بڑے پیارے انداز میں آپ کی اُس شخصیت کا تعارف کرایا ہے:

﴿اے نبی! یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم اُن لوگوں کے لئے نرم مزاج ہو، اگر سخت زبان، سخت دل ہوتے تو آس پاس سے سارے لوگ چھٹ جاتے﴾[آل عمران:159]

واضح رہے کہ بارُعب اور باوقار شخصیتیں اِس ضمن میں نہیں آتیں کیونکہ ایسی شخصیتوں سے خوف اور دہشت، گھبراہٹ اور بے اطمینانی کا ماحول نہیں بنتا، بلکہ دلوں میں اُن کا ادب واحترام اور پاس ولحاظ پرورش پاتا ہے۔

سلام کا رواج

اسلام میں جنت کا تصور بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جنت کا تصور، تصورِ آخرت کے عقیدے پر قائم ہے۔ جس مذہب میں آخرت کا عقیدہ نہیں، وہاں جنت اور جہنم کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ جو لوگ دنیاوی زندگی ہی کو ایک مکمل زندگی سمجھتے ہیں اور اُس کے بعد کی دنیا کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، ان کے لئے جنت اور جہنم ایک بے معنی بات ہے۔ البتہ جہاں آخرت کا عقیدہ موجود ہے وہاں جنت اور جہنم کا تذکرہ ہے اور اُس پر مکمل ایمان اور یقین ہے۔ قرآن جگہ جگہ جنت کا تذکرہ کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو مختلف اعمال کے حوالے سے بتاتا ہے کہ اگر وہ فلاں فلاں عمل کرتے ہیں تو اُنھیں جنت میں جگہ ملے گی ورنہ نہیں۔ جنت ایسا عالیشان محل ہے جس سے اللہ کی رضا جُڑی ہوئی ہے۔ جو جنت میں گیا اللہ اُس سے راضی یا جس سے اللہ راضی وہ جنت میں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی دعاؤں میں بار ہا جنت الفردوس کا سوال کرتے تھے۔ یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ ایمان والا آخرکار جنت میں جائے گا، لیکن ہر ایمان والا پوری شان کے ساتھ پہلی ہی فرصت میں جنت میں چلا جائے؟ ایسا نہیں، بلکہ وہی بندہ پوری شان و شوکت کے ساتھ جنت میں جائے گا جو پورا ایمان والا ہوگا۔ ایمان بہت سی چیزوں سے مل کر پورا ہوتا ہے۔ اُن میں ایک چیز ہے: آپس میں میل محبت کے ساتھ رہنا۔ اگر دلوں میں محبت نہیں تو ایمان مکمل نہیں۔ صاحب ایمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے بہت سے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑک رہی ہوتی ہے۔ اُن کا دل بغض، حسد اور کینہ جیسی گندی بیماریوں میں لت پت رہتا ہے۔ اِس طرح سے صاحبِ ایمان ہونے کا دعویٰ کھوکھلا اور بے معنی ہے۔

نفرت کو محبت سے بدلنے اور محبت کو مزید ترقی دینے کا سب سے آسان نسخہ یہ ہے کہ آپس میں سلام کو رواج دیا جائے اور ایک دوسرے کو سلام کرنے کا خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے۔

اوپر جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے ماخوذ ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: ''تم جنت میں نہ جاؤ گے جب تک کہ تم پورے مومن نہ بنو گے اور تم پورے مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ آپس میں محبت نہ رکھو گے۔ کیا تمھیں ایک ایسی چیز نہ بتاؤں کہ اگر تم اُسے اختیار کرلو گے تو ایک دوسرے سے محبت پیدا ہو جائے گی؟: آپس میں سلام کو رواج دو''۔

(مسلم: کتاب الایمان/ باب بیان انہ لا یدخل الجنۃ الا المؤمنون (93)

غیر محفوظ سفر

آج کے زمانے میں سفر نہایت غیر محفوظ ہو چکا ہے، نہ سامان محفوظ ہے اور نہ جان، جبکہ آج پہلے کی بہ نسبت سفر میں بہت زیادہ بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔اسٹیشن آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ اسٹیشنوں اور ٹرینوں میں پولیس اور گارڈ بھی ساتھ ساتھ ہوتے ہیں،مگر اس کے باوجود آج کا انسان سفر میں محفوظ نہیں۔سامان اور جان کے علاوہ عورتوں کی عزت تک محفوظ نہیں۔حالتِ سفر میں عورتوں کی بے عزتی کی خبریں آئے دن اخبار میں چھپتی رہتی ہیں۔

2 فروری کو ٹائمس آف انڈیا کی ویب سائٹ میں ایک خبر چھپی تھی جس کی ہیڈنگ تھی:

"Woman is raped in moving train"

"Earnakulam shornur passenger train" میں ۲۳ سال کی ایک عورت سفر کر رہی تھی، وہ جس کمپارٹمنٹ میں تھی، وہ خالی پڑا ہوا تھا۔ایک ۳۴ سالہ مرد اندر داخل ہوا اور اُس نے عورت کو تنہا پاکر زنا بالجبر کیا اور پھر اُسے چلتی ہوئی ٹرین سے باہر پھینک دیا۔وہ عورت ٹرین کی پٹری پر خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی۔وہ بری طرح زخمی تھی اور اُس کی حالت انتہائی نازک تھی۔(times of india:feb2,2011)

30 اپریل کو ٹائمس آف انڈیا ہی کی ویب سائٹ میں ایک اور خبر چھپی تھی جس کی ہیڈنگ تھی:

"Woman raped by railway official in moving tarain"

Ajmer DadarTrain میں جنرل کوچ میں سفر کرنے والی ۲۵ سالہ ایک عورت، ٹی ٹی سے ملی۔52 سالہ ٹی ٹی اُسے AC کوچ میں آرام دِہ سیٹ دینے کے بہانے لے گیا اور وہیں چلتی ہوئی ٹرین میں اُس نے عورت کے ساتھ زنا بالجبر کیا۔بعد میں عورت کے اَلارم بجانے پر مسافر وہاں اکٹھا ہوئے اور ٹی ٹی پکڑا گیا۔(times of india:apr30,2011)

جس طرح دورِ جدید میں سفر غیر محفوظ ہے،اُسی طرح ''دورِ جاہلی'' میں بھی سفر غیر محفوظ تھا۔ کسی قافلے کو دور دراز کا سفر بہت مشکل تھا۔قافلے اکثر لوٹ لئے جاتے تھے۔تجارتی قافلے کا بچ کر نکل جانا بڑی خوش قسمتی کی بات ہوتی۔سب سے پہلی مرتبہ جس نے سفر کو محفوظ اور پُر اَمن بنایا، وہ اسلام تھا۔اسلام کی آمد کے بعد ہی یہ ممکن ہوسکا کہ لوگوں کو اپنے تجارتی قافلوں کا خطرہ نہ رہا، یہاں تک کہ عورت کے لئے بھی آسان ہوگیا کہ وہ تنہا بے خوف وخطر سفر کر سکے۔عدی بن حاتم نے جب پہلی

مرتبہ اسلام کے بارے معلومات حاصل کرنے کے لئے پیغمبرِ اسلام ﷺ سے ملاقات کی تھی تو اُن کے اسلام نہ لانے پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے اُن سے یہ بھی کہا:

شاید تم اسلام میں اِس لئے داخل نہیں ہو رہے ہو کہ مسلمانوں کی تعداد کم ہے اور اُن کے دشمن زیادہ ہیں۔ اللہ کی قسم! تم بہت جلد سنو گے کہ قادسیہ (عراق) سے عورت اپنے اونٹ پر سوار ہو کر کعبے کی زیارت کے لئے نکلی اور اُسے کوئی خوف نہیں تھا۔

مسلمان ہونے کے بعد عدی بن حاتم نے پیغمبر کے حق میں گواہی پیش کرتے ہوئے کہا تھا: ''میں نے دیکھ لیا کہ عورت قادسیہ سے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر نکلی، اُسے کوئی خوف نہیں تھا، یہاں تک کہ اُس نے آکر کعبے کا حج کیا''۔ (سیرۃ ابن ہشام عربی: 4/223)

ایسا کیوں ممکن ہو سکا کہ دورِ جاہلی کے غیر محفوظ سفر کو اسلام نے محفوظ بنا دیا تھا اور عورت بھی بےخوف و خطر سفر کر سکتی تھی؟ اصل میں اسلام نے جو انقلاب پیدا کیا تھا، وہ ذہنوں اور دلوں کا انقلاب تھا، وہ فکر اور جذبات کا انقلاب تھا۔ اسلام نے انسانوں کے ذہنوں کو روشن، دلوں کو صاف ستھرا، فکر کو سنجیدہ اور جذبات کو پاکیزہ کر دیا تھا۔ اِس لئے گندی طبیعت اور برے ذہن کے لوگ یا تو رہ نہیں گئے تھے یا وہ اسلامی حکومت کے سخت قانون کی وجہ سے دَبے ہوئے تھے۔ آوارگی تھی نہیں یا آوارہ لوگ ڈر کے مارے گھروں میں گھُسے ہوئے تھے اور اُن کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ جب تک اسلامی فکر اور مزاج کا غلبہ تھا یا اسلامی ماحول سے متأثر لوگوں کی تعداد زیادہ تھی یا اسلامی قانون کی بالادستی قائم تھی، راستے بےخطر تھے، سفر محفوظ تھا اور عورت کی عزت برقرار تھی، اُس کے ساتھ کوئی زور زبردستی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن آج کا دورِ جدید اتنا لکھ پڑھ لینے کے باوجود، اتنا مہذّب اور سائنسی ہونے کے باوجود، الیکٹرانک سسٹم سے پوری طرح لیس ہونے کے باجود، سفر کو محفوظ نہیں بنا سکا۔ کسی عورت کا سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ تنہا ہونے پر بھی اُس پر کوئی آفت سکتی ہے اور دوسرے مسافروں کے ہوتے ہوئے بھی وہ مصیبت میں پھنس سکتی ہے۔ اتنے بڑے پیمانے پر یہ خرابی صرف اِس لئے ہے کہ دورِ جدید، اسلام کو نظر انداز کرنے کی مسلسل غلطی کر رہا ہے، جس کا بھیانک انجام اُس کے سامنے ہے۔ دورِ جدید کو چاہئے کہ وہ ایک بار ''اسلام'' کا عملی تجربہ کر کے دیکھے۔ شاید اُس پر محفوظ سفر کا کوئی راستہ کھلے۔